

جناب نفع اقبال

عہد رسالت ﷺ اور سائنس و ٹیکنالوجی

ترقی، سائنس، ارتقاء اور معیار زندگی کی بلندی کے مفروضات کی تلاش میں سرگرداں ہونے سے قبل اس سوال پر نہایت گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے کس موڑ پر تشریف لائے۔ جب آپ دنیا میں آئے تو اس دنیا کا کیا نقشہ تھا؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نبوت کے لیے جس خطے کا انتخاب کیا اس کی جغرافیائی اہمیت و حیثیت کیا تھی؟

مکہ مکرمہ قدیم اور جدید جغرافیہ دانوں کی تحقیق کے مطابق دنیا کے وسط میں واقع ہے۔ گویا کائنات کی مرکزی، ہستی ختمی مرتبت ﷺ کو کائنات کے مرکز میں مبعوث کیا گیا، اس بعثت کے ذریعے خانہ کعبہ کی مرکزیت کو دنیا کے لیے ایک مرتبہ پھر ابد تک قائم کر دیا گیا کہ اب پوری دنیا کو رہتی دنیا تک اس مرکز خداوندی اور اس مرکزی ہستی رسالت مآب ﷺ کے ساتھ دائمی تعلق قائم کرنا ہے جو تمام عالمین کے لیے رحمت اور کفایہ للناس ہیں اور آپ ﷺ کا پیغام پوری دنیا کے لیے آخری، حتمی، قطعی اور ابدی پیغام ہے۔

جزیرۃ العرب کی جغرافیائی اہمیت یہ ہے کہ دنیا کے تین براعظم اس سے ملتے ہیں۔ حج کی عبادت کے باعث دنیا بھر کے تجارتی قافلے جزیرۃ العرب کے ذریعے اس سرزمین سے، جو نہ صرف مرکز کائنات [Centre of Universe] بلکہ ازل سے ابد تک کے لیے مرکز رشد و ہدایت بھی ہے، تجارت، کاروبار، حج اور اسفار کے ذریعے مسلسل رابطے میں رہتے تھے اور پیغام رسالت مآب ان قافلوں کے ذریعے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں فطری طریقے سے پہنچ سکتا تھا۔ یہ پیغام لے جانے والے پیغام رسالت ﷺ کی صرف زبانی ترسیل نہ کرتے بلکہ پیغام دینے والے پیام بر کی سیرت اور شخصیت کے گوشوں سے بھی ذاتی طور پر واقف ہوتے تھے کیونکہ وہ قرآن مجسم رسالت مآب ﷺ کو جزیرۃ العرب کے گرد و غبار، درود و بار، دیار و امصار، کوچہ و بازار اور نقش و نگار میں ایک نورانی و روحانی وجود کے طور پر چلتا پھرتا ہوا پاتے تھے۔ ایک لفظی قرآن تیس سپاروں میں بند تھا اور دوسرا عملی قرآن مکہ کے گلی کوچوں میں شب و روز ان کے درمیان موجود تھا جس کے ایمان کی حرارت سے پھر دل پکھل رہے تھے اور صحرا میں موجود ریت کے ذروں کو بھی شعور حاصل ہو رہا تھا۔ آپ کی سیرت کے گوشے ان کے لیے مہر جہاں تاب کی کرنوں کی طرح روشن تھے۔ یہ پیغام رسانی عین التئمن کے درجے میں ہوتی تھی۔

عالم عرب کے ایک جانب پرانی فلسفہ سائنس منطق، تفسیر و تہجد کے آثار محفوظ تھے تو دوسری جانب

ایران، چین، ہند اور روم کی تہذیبیں اپنے علوم و فنون کی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ تھیں۔ فلسفہ، سائنس، ٹیکنالوجی اور علوم عقلیہ میں جزیرۃ العرب ان اقوام سے مسابقت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، جس قوم، بنی اسماعیل، میں آپؐ تشریف لائے وہ اُمّیون تھے، صرف اہل کتاب اس خطے میں لکھنے پڑھنے سے واقف تھے، اس کے برعکس مدارس اور جامعات کے ذریعے تعلیم یونان، ہند، چین اور ایران کے خطوں میں عام تھی۔ ان خطوں سے متصل ماضی کی مٹی ہوئی تہذیبیں ہڑپہ، موہنجودڑو، نیکسلا کے آثار بھی اس بات کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی آمد سے پہلے کی عظیم الشان قوموں اور ان کے عہد میں موجود مخالف تہذیب و تمدن کے علوم عقلیہ [Natural Philosophy, Science & Technology] سے کچھ عطا نہیں کیا گیا۔

چین، ہند اور روم، یونان اور ایران کی عمارات کے مقابلے میں مدینہ النبیؐ میں کوئی ایک عمارت عہد رسالت میں تو کیا اس کے بعد بھی آج تک تعمیر نہیں کی جاسکی تو آخر کیوں؟ انیسویں صدی کے آخر تک مکہ معظمہ میں فراہمی آب و نکاسی فضلات [Water and Drainage system] کا کوئی باقاعدہ نظام موجود نہیں تھا، جبکہ رسالت مآب ﷺ کی آمد سے تین ہزار سال پہلے کی تہذیب موہنجودڑو میں نکاسی غلات کا زبردست نظام موجود تھا۔ مدینہ النبیؐ میں اس طرح کی سرکس، گلیاں، بازار، مکان، سماعت گاہیں [Auditorium] اور یونیورسٹیاں، موجود نہ تھیں جو رسالت مآب ﷺ کی آمد سے پہلے موہنجودڑو، ہڑپہ، نیکسلا، یونان اور روم وغیرہ کی تہذیبوں میں موجود تھیں۔ اتنی عظیم الشان تہذیبوں قوموں اور تمدنوں کے مقابلے میں جو ہر قسم کے علوم و فنون سے آراستہ تھیں ایک ایسی ہستی کو کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا جو نہ لکھنا جانتی تھی نہ پڑھنا جانتی تھی اے نبی ﷺ! آپؐ اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے: وَمَا كُنْتُمْ تَقْلُوْا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتٰبٍ وَلَا تَخْطُبُوْا بِمِیْنٰكٍ اِذَا لَاَزَقٰتِ الْمُبْتَطِلُوْنَ [۲۸:۲۹]۔ ایسی ہستی کا انتخاب کرنے کی حکمت مالک الملک کے سوا کون جان سکتا تھا؟ عرب میں یہودی بھی لکھنے کے فن سے واقف تھے مگر اس فن کی خالق کائنات کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی کہ یہودی اس کتاب کو بھلا چکے تھے جو زندگی کا سرچشمہ تھی لہذا اس سرچشمے سے لاطلفی کے بعد کوئی علم اور کوئی ہنر پرکاش کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا، رسالت مآب ﷺ میں امی ہونے کی مفت کو عیب کے بجائے اس ہستی کے حق میں ہنر اور کمال قرار دیا گیا اور قرآن نے ”امی“ کے لقب سے آپؐ کو اور آپؐ کی قوم کو خود پکارا۔

یہ پکار یہ اعلان اس امر کا استعارہ ہے کہ اے اہل عالم! تمہاری نظر میں جبل اور علم کے دوازے، اس کے اصول و منہاج، پیمانے، اور معیارات، اسکے اندازے، اس کو پرکھنے کے تمام طریقے اور اس کی تمام تعریفیں بالکل غلط ہیں، تم عظیم الشان عمارتوں، کتابوں، کتب خانوں، اداروں، مدرسوں، فلسفوں، سائنس و منطق کو علم سمجھتے ہو مگر یہ کیسا علم و عقل اور کیسی روشنی ہے کہ تم حقیقت کلی اور مالک حقیقی کی معرفت بے محروم ہو، وہ علم جو تمہیں حقیقت الحق سے وابستہ

نہ کر سکے وہ قیامت تک علم نہیں جمل ہے۔ علم وہ ہے جو تمہیں اپنے خالق کی معرفت سے آگاہ کرے اور اپنی آخرت سنوارنے کے طریقے بتائے لہذا اصلاً اُمی رسالت مآبؐ ہمیں اہل یونان روم، ہند، چین و ایران ہیں۔ جو ہدایت کی روشنی سے محروم ہیں جو اپنے مالکِ حقیقی کو پہچاننے سے قاصر ہیں جو اس نور سے محروم ہو اس سے بڑا محروم کون ہو سکتا ہے۔

امی ہونے کے باوجود رسالت مآب ﷺ پر علم کس ذریعے سے نازل کیا گیا؟ کیا قلم ہے؟ جس کی قسم سورۃ علق میں کھائی گئی، کیا کتاب ہے؟ جو اس عہد کے تمام بڑے تمدنوں میں موجود تھی؟ کیا قرطاس ہے؟ جو اس عہد کے لوگوں کے لیے اجنبی نہ تھا؟ بلکہ علم آپ ﷺ کے قلب اطہر پر نازل کیا گیا کہ یہی قلب علم کا اصل سرچشمہ ہے، انبیاء اسی قلب کو درست کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں جس میں باطل نقب لگا تا رہتا ہے: ”ان سے کہو کہ جبریل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن آپ کے قلب پر نازل کیا ہے“۔ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ [۹۷:۲] اللہ تعالیٰ نے رسالت مآب ﷺ کی رسالت کو قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے وسیع فرمادیا اور آپ پر نبوت کا اہتمام کر دیا آپ کا کافہ للناس ہیں، آپ کی ہستی کو اللہ تعالیٰ نے ابد تک کے انسانوں کی زندگی سنوارنے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینے کے لیے مبعوث فرمایا: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ [۲:۱۲۹] ان زمانوں کے لیے بھی جو سائنس و ٹیکنالوجی میں سب سے آگے ہونے کا دعویٰ کریں، قرآن نے واضح کر دیا کہ اور [اس رسول کی بعثت] ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں: ”وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“ [۳:۶۲]۔

رسالت مآب ﷺ کو اپنے عہد کے عظیم الشان تمدنوں کے سامنے کھڑا کر کے دنیا کو قیامت تک کے لیے بتا دیا گیا کہ اصل علم و دانش اور روشنی و نور وحی الہی اور علومِ تقلید سے حاصل ہوتا ہے۔ اس روشنی، نور اور دانش سے محروم معاشرے مادی طور پر خواہ کتنے ہی عظیم الشان ہوں وہ تاریک ترین اور جہالت میں غرق ہیں اور ان کو جہالت سے نکال کر روشنی میں لانا امت وسط کی بنیادی ذمہ داری ہے، جو صبح قیامت تک برقرار رہے گی۔ رسالت مآبؐ کو قرآن نے سراج منیر کے نام سے پکارا اس لیے کہ العلم، الکتاب آ جانے کے بعد روشنی اور علم آ جاتا ہے اور ”امیت“ باقی نہیں رہتی لہذا قرآن نے اُنہی ان کو کہا جو اپنی قوم کے ایک بے مثال فرد پر روشنی، نور، فرقان، میزان، فصل الخطاب، حکم، لب، ضیاء، ذکر، حکمت، خیر کثیر اور العلم نازل ہونے کے باوجود اس سے دانستہ محروم رہے، جو الکتاب کے نزول کے باوجود اس نور سے چھوٹنے والے علم سے بے بہرہ تھے ان میں ایک دوسرا گروہ امیوں کا ہے جو کتاب کا تو علم نہیں رکھتے بس اپنی بے بنیاد آرزوؤں اور امیدوں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں: ”وَمِنْهُمْ أَقْيُونٌ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَسَاقِي وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ“ [۷۸:۲] کتاب ہدایت سے محرومی اور العلم کے مقابلے میں

وہم وگمان کی پیروی اور بے بنیاد امیدوں و آرزوؤں کے لیے نگرانی ”امیت“ ہے اور اسے ترک کرنا نور، روشنی، برہان، فرقان، عرفان، ایمان، سراج اور چراغ ہے۔ اس روشنی کا نتیجہ وہ عظمت و شوکت، رعب و دبدبہ، ہیبت و فضیلت اور اعزاز و اکرام، ہے جو حاصل وحی گروہ کو روئے زمین پر عطا کی جاتی ہے: ”مگر دیکھ لو دنیا ہی میں ہم نے ایک گروہ کو دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت میں اس کے درجے اور بھی زیادہ ہوں گے اور اس کی فضیلت اور بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر ہوگا“: كَلَّا لَمَلَّ هَؤُلَاءِ وَ هَؤُلَاءِ مِنْ عَطَايِ رَبِّكَ وَ مَا كَانَ عَطَايَ رَبِّكَ مَحْظُورًا اَنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَ لِلْآخِرَةِ الْكَثِيرُ فَاَكْبَرُ تَفْصِيْلًا [۲۰: ۲۱: ۱۷] اس فضیلت کا ایک اثر قرآن نے یہ بھی بیان کیا کہ اس گروہ کے کردار، اقبال اور گفتار کے باعث اللہ تعالیٰ اہل عالم کے دلوں میں ان کے لئے محبت پیدا فرمادیں گے: الرَّحْمٰن وَ اَدَّ [۹۶: ۱۹] یہ عزت، محبت، برتری اور فضیلت سائنس ٹیکنالوجی کی بنیاد پر نہیں علم صحیح اور اعمال صالحہ کے صلے میں عطا ہوگی۔ اس محبت کا سبب ان کی اخلاقی و روحانی ایمانی فضیلت ہوگی اور کچھ نہیں۔ قرآن کے الفاظ میں یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں عنقریب رحمان ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔ پس اے نبی ﷺ اس کلام کو ہم نے آسان کر کے تمہاری زبان میں اس لیے نازل کیا ہے کہ تم پر ہیرو گارڈوں کو خوش خبری دے دو: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ تُنْذِرَ بِهِ قَوْمًا لَّدَا [۹۷: ۱۹] حضرت ابراہیم نے بھی اپنے رب سے اپنی اولاد کے لیے دعا فرماتے ہوئے یہ آرزو کی تھی کہ ”لہذا آپ لوگوں کے دلوں کو ان [اپنی اولاد] کا مشاق بنا دیجیے اور انہیں کھانے کو پھل دیے۔ رَبَّنَا اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ بُوَادٍ غَیْرِ ذٰی زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ الْفِدَۃَ مِنَ النَّاسِ تَهْوٰی اِلَیْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِنْ السَّمَٰوٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ [۱۳: ۳۷] یہ مرتبہ اور فضیلت تاریخ کے کسی بھی دور میں، کسی بھی مرحلے پر، کسی بھی وقت حاصل کی جاسکتی ہے لیکن جدیدیت کے زیر اثر عہد حاضر کے بعض راسخ العقیدہ مسلمان حلقے بھی اب اس فضیلت کے کچھ زیادہ قائل نہیں رہے ہیں، انکے خیال میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے بغیر فضیلت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور کم از کم عصر حاضر میں صرف اخلاق اور کردار پیدا کرنے سے کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا، بالفاظ دیگر امت کی علیت اور مابعد الطبیعیات معرفت رفتہ تبدیل ہو رہی ہے۔ تو کیا سائنس و ٹیکنالوجی کا انکار کر دیا جائے؟ سوال انکار و اقرار کا نہیں اصول کا ہے، اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو اس لیے تباہ نہیں کیا کہ وہ سائنس و ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ گئی تھی بلکہ اس لیے تباہ کیا کہ وہ گناہ گار زندگی میں بہت آگے بڑھ گئی تھی اور پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھی اور کسی قوم کو عروج اس لیے عطا نہیں فرمایا کہ وہ سائنس و ٹیکنالوجی میں اپنی مقابل تہذیب سے بڑھ گئی تھی۔ استخلاف فی الارض پاکیزگی قلب و نظر سے مشروط کیا گیا ہے، سائنس و ٹیکنالوجی زیادہ سے زیادہ فرض کفایہ کے درجے میں ہے لیکن اب امت صرف اس کے حصول کو واحد فریضہ

دینی تصور کر رہی ہے۔ فرض کفایہ نے افضل ترین فرض کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ یہ ہے فکر و نظر میں تبدیلی کی فضیلت، برتری، کامیابی اور استخلاف کا واحد سبب محض سائنس و ٹیکنالوجی کو سمجھ لیا گیا ہے۔ پوری امت اسی کی تعلیم و تحصیل کو افضل ترین علم تصور کر رہی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے زوال کی رات مزید گہری ہو رہی ہے۔ امید کا مرکز العلم اور الکتاب نہیں بلکہ وہ علم ہو گیا ہے جو مغرب نے تخلیق کیا ہے اور ہم صرف اسی علم کی آرزو سے تبدیلی کی صبح کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ وہ بنیادی تغیر، رویہ اور سوچ ہے جس نے امت کیلئے بلندی کے تمام راستے مسدود و محدود کر دیئے ہیں۔ قرآن میں عروج و زوال سے متعلق آیات میں ایک آیت بھی ایسی نہیں بتائی جاسکتی جو عروج کو صرف اور صرف سائنس و ٹیکنالوجی کے حصول سے مشروط کرتی ہو، نہ ہی استخلاف کی کسی آیت میں کسی نبی کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ زمین میں اقتدار کے بعد سائنس و ٹیکنالوجی کے علم کی تدريس و تعليم کو اولیت دیں گے، ہر جگہ صلوة، زکوٰۃ، امر بالعرف و نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے جس علم کو جو مرتبہ و مقام دیا گیا ہے اس مرتبے و مقام سے اسے ہٹا دیا جائے تو یہ عدل نہیں ظلم ہے اس ظلم کے اقرار اور اس پر تین سو برس سے مسلسل اصرار کے باوجود امت کا حال کیا ہے؟ ملیشیا، ترکی، ایران، سوڈان، مصر اور پاکستان تمام تر دعوؤں کے باوجودندین میں آگے ہیں نہ دنیا میں شکست کی رات مسلسل طویل ہو رہی ہے۔

قرآن حکیم نے عروج و زوال کے قانون میں کہیں سائنس و ٹیکنالوجی کو زوال یا عروج کا سبب قرار نہیں دیا۔ اسی لیے اللہ کے یہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے [۱۳:۴۹] سائنس دان اور ٹیکنالوجسٹ ہونا کوئی عظمت نہیں۔ اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیساتھ رکوع و سجود میں اللہ کے فضل کی تلاش کیلئے سرگرداں رہتے تھے: مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكْعًا سُجَّدًا لِّفَضْلٍ مِنَ اللَّهِ وَرَضُونَ بِمَا آمَنُوا فِي وَجْهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَنَّهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَنْ لَهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطَنَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا [۲۹:۴۸] تسخیر کائنات، تسخیر ارض اور سائنس و ٹیکنالوجی کی تلاش میں انھیں سرگرداں نہیں پایا گیا اسی لیے قرآن نے بتایا کہ گناہ عظیم پر اصرار کرنے والے جہنم میں ہوں گے: إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُتْرَفِينَ وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنثِ الْعَظِيمِ [۴۵، ۴۶: ۵۶] سائنس و ٹیکنالوجی نہ جاننے والوں یا اس میں پیچھے رہ جانے والوں کو قرآن کی کسی ایک آیت میں بھی جہنم کی وعید نہیں سنائی گئی، آخر کیوں؟ حضرت ابراہیم کو ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا گیا: فَأَوْحَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قَالُوا لَا تَخَفْ وَبَشِّرُوهُ بَعْلِمٍ عَلِيمٍ [۲۸:۵۱] تو اس علم سے مراد سائنس و ٹیکنالوجی کا علم نہیں خالق کائنات کی معرفت اور آخرت کی حقیقت کا علم مراد تھا۔ حضرت یحییٰ کو اللہ نے بچپن میں حکم سے نوازا ایسے خفیہ تحفہ الکتاب بقرۃ و اثبتنہ الحکم صبیًا [۱۲:۱۹] جبکہ حکم کی یہ صفت دیگر انبیاء کو نبوت کے

ساتھ عطا کی گئی یہ حکم کیا سائنس و ٹیکنالوجی تھا؟

کفار و مشرکین کی جہاں کا سبب یہ تھا کہ ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے: وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ [۳۶:۳۶] ایسے تمام افراد اور تمام قوموں پر اللہ کا عذاب ان کے گناہوں کے باعث نازل ہوا: فَكَلَّا اخْلَدْنَا بِلَهْمِهِ [۴۰:۲۹] اور مومنین کی کامیابی کا سبب یہ تھا کہ وہ گناہگار زندگی سے نفرت کرتے تھے پاکیزہ زندگی بسر کرتے اور اس دنیا کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ذمے دار بنائے گئے اس لیے جو آخرت کا خواہش مند ہوا اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے اور ہو وہ مومن تو ایسے ہر شخص کی سعی منکور ہوگی [۱۹:۱۷] اللہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے: يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ [۳۰:۳] وہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا: مَا أَشْهَدُ لَهُمْ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلْقَ أَنْفُسِهِمْ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُظْلِمِينَ عَصَدًا [۵۱:۸] أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمَ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ [۷۰:۹] اور تمہارا رب بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے اگر وہ ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑنا چاہتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا فَاتَّبَعَ سَبَبًا [۸۵:۱۸] الکہف] اسی لیے اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے لیے لازم کر لیا ہے [۳۵:۶] اس رحمت کے باعث وہ فوراً سزا نہیں دیتا، اگر وہ کہیں لوگوں کو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو ایک محین مدت تک مہلت دے رہا ہے [۳۵:۳۵] لہذا وہ انسان کو مہلت عمر دیتا ہے کہ وہ عہد الست کو یاد کر کے اپنے خالق کی پناہ میں آجائے۔ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا [۳۷:۳۵] انسان نے وہ قرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا: كَلَّا لَمَّا بُقِضَ مَا أَمَرَهُ [۲۳:۸۰] یعنی بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے نیکیوں میں سبقت کرنے والے: أَوَلَيْكَ يُسْرِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ [۶۱:۲۳] اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کے لیے عرصہ حیات کا تعین اس لیے فرمایا کہ ان کے اندر جو خیر مخفی ہے اس کو ظاہر ہونے کا موقع عطا فرمائے اور یہ عمر اس خیر کے ظہور میں آنے کے لیے بہت کافی ہے لیکن یہ انسان عہد الست کو یاد کرنے کے بجائے ویسی ہی بحثوں میں پڑ گئے جیسی بحثوں میں بھٹی گمراہ قوموں کے لوگ پڑے تھے: كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَ أَكْثَرَ أَمْوَالًا وَ أَوْلَادًا فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلْقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلْقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلْقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا أُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ وَ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ [۶۹:۹]

مومنین اس دنیا کو عیش کی بجائے مشقت، آزمائش اور امتحان کی جگہ سمجھتے تھے کیونکہ انسان کو مشقت میں پیدا کیا گیا ہے [۴۰:۹۰] اور عیش صرف جنت میں میسر ہوگا جہاں ہر خواہش پوری ہوگی [۱۶:۲۵] جو کچھ [جنت میں] وہ طلب کریں گے ان کے لیے حاضر ہے [۵۷:۳۶] اور جہاں کسی قسم کی مشقت ہوگی نہ ٹکان لاحق ہوگی [۴۸:۱۵] لہذا کفار دنیا میں عیش و عشرت تلاش کرتے ہیں مومن اسے جنت کے حصول تک ملتوی کر دیتے ہیں اور سادہ زندگی کو اپنے پیغمبر کی اتباع میں اپنا اوڑھنا بھوننا بنا لیتے ہیں۔ کفار کو جب اقتدار ملتا ہے تو وہ اس زمین کو جنت ارضی بنانا چاہتے ہیں ان کی دوڑ دھوپ دنیا سے زیادہ سے زیادہ تسبیح پر مرکوز رہتی ہے اور مومنین استخلاف فی الارض کی نعمت ملنے کے بعد نماز، زکوٰۃ کا نظام قائم کرتے اور معروف کی تلقین و مکر کا خاتمہ کرتے ہیں: **الَّذِينَ اِنْ مَكَّنْهُمْ لِي اِلَازِصِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُورِ** [۴۱:۲۳] وہ متاع دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے [۱۵:۸۸، ۲۰:۸۱، ۱۸:۲۷] نماز انھیں سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے کہ یہ دین کا ستون ہے۔ اور کفر اور اسلام میں حد فاصل ہے اس لیے قرآن میں آتا ہے ”اور جہاں بھی تم ہو اسی [مسجد حرام] کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی جت نہ ملے: **وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ شَطْرَهُ لِنَلٰى يَكُوْنَنَّ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِیْ وَلَا یَسْمِعُنِیْ عَلَیْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ** [۱۵۰:۲] یہ آیت کفر و اسلام میں حد کا تعین کرتی ہے ارشاد ہے اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو: **وَاْمُرْ اَهْلَکَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا لَا نَسْئَلُکَ رِزْقًا نَحْنُ نَنْزِلُکَ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقِیِّیْنَ** [۱۳۲:۲۰] مومنین کو تجارت خرید و فروخت اللہ کی یاد اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی: **رَجَالَ لَا تُلَیْهِمْ بَیْعَارَةٌ وَلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَ اَقَامِ الصَّلَاةَ وَ اِيتِیْ الزَّكَاةَ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ** [۳۷:۲۳] نماز کے بغیر ایمان معتبر نہیں ہے اس لیے سورہ توبہ میں مشرکین کو چار مہینے کی مہلت دی گئی تو یہ بھی کہا گیا کہ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کر دیں تو انھیں چھوڑ دو: **فَاِذَا اَنْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرْمَ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ وَ خَلَدُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ کُلَّ مَرْصِدٍ لَّانْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَ اَتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ** [۵:۹]

نماز اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی مخلوق کا حق ہے ان دونوں حقوق کے بغیر ایمان قابل قبول نہیں ہے، اسی لیے حضرت ابو بکرؓ نے مکرین زکوٰۃ کے خلاف جنگ کی اور فرمایا کہ اگر یہ اونٹ کی سی کے برابر زکوٰۃ دینے سے بھی انکار کریں گے تو ان کے خلاف جنگ ہوگی اس معاملے میں کوئی رعایت نہیں ہو سکتی۔

دنیا بھر میں کروڑوں مسلمان بھوک و افلاس سے مجبور ہیں فقر و فاقہ لاکھوں مسلمانوں کو کفر کے قریب لے

گیا ہے لیکن ان خوشحال مسلمانوں کو ان بے کس و بے بس مجبور و بے نوا مسلمانوں کی کوئی فکر نہیں دنیا دار علمائے انھیں یہ سبق سکھا دیا ہے کہ خوب کھانے اور اچھا پہننے میں کوئی حرج نہیں: **فَبَآئِيَ الْآءِ رَبِّكُمْ فَتُكْذِبُ**۔ کیا قرآن کی اس آیت کا عمل یہی ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم بھوک سے مر رہے ہوں اور یہ اللہ کی نعمتوں کی شکر گزاری کے نام پر عیش و عشرت میں مصروف ہوں؟ پورے عالم اسلام کا یہی حال ہے بھارت کے مسلمان جو سب سے زیادہ اذیت، تکلیف اور مصیبت میں ہیں ان کا حال اس غلامی میں یہ ہے کہ جامع مسجد دہلی کے محن میں پتنگیں اڑائی اور لڑائی جاتی ہیں اور بو کاٹا کے نعرے لگا کر مسلم پتنگ باز ایک دوسرے پر جھپٹتے اور دوڑتے پھرتے ہیں۔

ممتاز محقق ڈاکٹر عارف نوشاہی اپنے سفر نامے ”ارمغان ہندوستان“ میں لکھتے ہیں: ”مسجد جمالی کے باغچے یعنی محن کے گھاس پر بیٹھے تین آدمی تاش کھیل رہے تھے میں جوتے اتار کر مسجد میں داخل ہوا تو آگے والا ان میں ایک بھٹی جوتوں سمیٹ مسجد کی صفائی کر رہا تھا۔“ دہلی کی جامع مسجد کے بارے میں ان کے تاثرات دیکھیے: مسجد کے محن میں اتنے نمازی اور سیاح نہ تھے جتنے پتنگ باز لڑکے پتنگ بازی میں مصروف کوئی انھیں روکنے والا نہ تھا، لگتا ہے ہندوستانی تاریخی مسجدیں تاش بازی اور پتنگ بازی کے لیے رہ گئی ہیں۔ [تفصیلات کے لیے ارمغان ہندوستان سفر نامہ عارف نوشاہی اور خلاصے کے لیے ماہنامہ الزیر شمارہ ۴-۲۰۰۸ء ص ۱۶۵]۔ خدا نخواستہ غیر مسلم اگر مساجد کے محن، آگلن باغ میں پتنگ اڑاتے نظر آتے تو حفاظت دین کے نام پر ان کے خلاف فساد برپا ہو جاتا لیکن خود جو چاہے کریں یہ وہ رویہ ہے جو مسلم قوم پرستی کے نظن سے جنم لیتا ہے، عجیب واقعہ ہے کہ ایک ہندو قبلہ رخ ہو کر حواج ضروریہ سے فراغت میں مصروف تھا ایک مسلمان نے دیکھا تو دینی حمیت کے باعث اس پر شدید ناراضگی، غصے، رنج اور دکھ کا اظہار کیا، ہندو شرمندہ ہوا معذرت کی کہ آپ کی دلا زاری ہوئی کچھ دنوں بعد ہندو نے اسی مسلمان کو یہی عمل قبلہ رخ ہو کر دہراتے دیکھا تو تعجب سے پوچھا کہ آپ نے منع کیا تھا پھر یہ عمل آپ کے لیے کیسے روا ہو گیا؟ جواب ملا یہ کعبہ ہمارا ہے ہم اس کے ساتھ جو چاہیں کریں تم غیر مسلم ہو تم نہیں کر سکتے۔ امت مسلمہ ان دنوں اسی افراط و تفریط کا شکار ہے۔ اس کی بنیادی وجہ علم اور تربیت کی شدید کمی اور بعض ہنگامی اسلامی تحریکوں کی روحانیت سے عاری جذباتیت اور شدت پسندی ہے۔ جس کے باعث مسلم قوم پرستی کا شجر مسلسل برگ و بار لارہا ہے۔

رسالت مآب کو حکم دیا گیا ”اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک خبردار کرنے والا اٹھا کھڑا کرتے پس اے نبی کافروں کی بات ہرگز نہ مایے اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کیجیے: **جِهَادًا كَبِيرًا** وَلَوْ هِشْنَا كَبَعْنَا فِی كُلِّ قَرْيَةٍ لَّذِیْرًا فَلَا تُطِيعُ الْكَافِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا [الفرقان ۵۲-۵۱] ان آیات میں بتا دیا گیا کہ قیامت تک کے لیے سرچشمہ روشنی کے طور پر کل دنیا کے لیے رسالت مآب کافی ہیں جس طرح ایک سورج سارے جہاں کے لیے کافی ہوتا ہے

۔ لاکھ ستارے ہر طرف ظلمت شب جہاں جہاں اک طلوع آفتاب دشت و چمن بھر کر

اہل کفر سے جہاد کے لیے رسالت مآب کو علوم عقلیہ اور آلات سائنس کے بجائے قرآن دیا گیا اور کہا گیا کہ اس کو لے کر کفار سے زبردست جہاد کرو۔ عہد حاضر کا مسلمان اس قرآن کو ایک طرف رکھ کر جہاد کا علمبردار ہے۔ روز قیامت اس امت سے اللہ تعالیٰ یہ سوال کریں گے کہ اس نے اس ذمہ داری کو کس درجے میں پورا کیا۔

اسی لیے جمعہ کے خطبوں میں دنیا بھر کی مساجد میں یہ حدیث پڑھی جاتی ہے کہ: ”خیر القرون قرون“ سب سے بہترین زمانہ عہد رسالت کا زمانہ ہے اور سب سے بہترین لوگ: السابقون الاولون ہیں جب ہم کہتے ہیں کہ خیر القرون سب سے بہتر زمانہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خشیت و معرفت الہی آخرت کے خوف اور دنیا سے نفور کے اعتبار سے وہ عہد مثالی و معیاری عہد تھا جب آخرت غالب تھی اور دنیا غیر اہم، کسی دل کو دنیا محبوب و مطلوب نہ تھی، حضرت خالد بن ولیدؓ جیسا کہ سالار بھی دنیا سے کوئی رغبت نہ رکھتا تھا، جب انتقال ہوا تو ترکے میں صرف ایک گھوڑا اور تلوار تھی، وہ بھی امت کے لیے وقف فرما دیے تھے اور اس بات کا رنج تھا کہ شہادت نصیب نہیں ہوئی۔ خیر القرون کا یہی مطلب ہے کہ دنیا غیر اہم اور مری ہوئی بکری سے زیادہ حقیر اور آخرت ہر شے سے زیادہ اہم ہو جائے، اس یقین کے بغیر امت کا عروج ممکن ہی نہیں۔ ان معنوں میں مسلمانوں کیلئے امید و آرزو، روشنی و نور، معیار و وقار و اعتبار، اور عظمت و شوکت کی ہر راہ ماضی سے پیوستہ ہو کر عہد رسالت ﷺ کے مدیۃ النبی سے وابستہ ہو جاتی ہے، اور اس امت کی ذمہ داری یہ بن جاتی ہے کہ وہ تاریخ کے پیچھے کو مسلسل عہد رسالت کی طرف موڑنے، خیر القرون سے وابستہ رکھنے اور پیچھے کی طرف بار بار پلٹانے کی کوششوں میں مصروف رہے اور ہر اس حرکت، جدوجہد، کوشش کو ترک کر دے جو مارکس، ہیگل اور مغربی فلاسفہ کے کافرانہ فلسفوں کے تحت ارتقا کے تاریخی سفر کے کفر کو عام کرتی ہے۔ تاریخ کے اس جدلیاتی نظریے کے مطابق ہر اگلا دور پچھلے دور سے بہتر ہوتا ہے اور ہر آنے والی نئی نسل گزر جانے والی نسلوں سے بہتر، زیادہ عاقل و بالغ و متبع النظر اعلم اور زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے۔

اسلامی تہذیب و تاریخ و عظمت میں اس قسم کے افکار کی کوئی منجائش نہیں۔ عہد رسالت سے بہتر زمانہ بہتر دور نہ آ سکتا ہے نہ آ سکے گا اور اس دور کا احیا، اس کی جدوجہد، اس روشنی کی جستجو اور جدوجہد اور جستجو کی خاطر زندگی وقف کر دینا بھی مطلوب دین ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عہد رسالت سب زمانوں سے بہتر ہے تو اس اعتراف و اعلان کا کیا مطلب ہے؟ کیا عہد رسالت کا طرز معاشرت تہذیب انداز نشست و برخاست سادگی بحالیات سادہ ترین زندگی اب ہمیشہ کے لیے متروک ہو چکے ہیں یا اس کا احیا ممکن ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارا طرز زندگی فرعون کا ہو، اور اس طرز زندگی میں خیر القرون کی روحانیت کو داخل کر دیا جائے؟ کیا دنیا کو ترجیح دینے والے نفس، نظام زندگی، معیشت، معاشرت تہذیب و ثقافت میں عہد رسالت کی روحانیت داخل کی جاسکتی ہے؟ جدید طرز زندگی کے اندر اسلام کی

روحانیت داخل کرنے کی آرزو محض سادگی کی انتہا ہے لہذا جب بھی دنیا پرست طرز زندگی دین میں داخل ہوگا اور دین دوسرے دروازے سے رخصت ہونے کے بجائے اس جدید مادی ڈھانچے میں تعمیر و تشکیل کے مرحلے سے گزر کر جدید مادیت کی اسلام کاری کرے گا تو روحانیت اس پیکر مادی سے خود بخود رخصت ہو جائے گی۔ دو مختلف طرز زندگی دو مختلف و متضاد مابعد الطبیعیات سے نکلنے والے ادارے، اقدار و روایات، علوم، رویے، اسالیب و مناج، اور طرائق ایک تہذیب میں نہیں سموئے جاسکتے، اس لیے گزشتہ سو برس میں عالم اسلام کے اخلاقی روحانی بحرانوں کا سبب یہی دوئی [Dualism] ہے جس کو جاری رکھنے کی علمی دلیلیں دنیا پرست علماء مسلسل دے رہے ہیں۔

نفس پرستی اور نفس کشی کی متضاد روایات ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ کیا خیر القرون کے عہد کی کیفیات اس دور کی سادگی اور دنیا سے کم سے کم تمتع کی روایت کے بغیر روحانیت کا منبع کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟ کیا اس جدید تہذیب تمدن اور طریقوں کو لفظ بہ لفظ ارتقاء زمانہ کے نام پر اختیار کر لیا جائے جس کے نتیجے میں لوگوں کا زندگی بسر کرنا بلکہ مغرب میں لوگوں کا مرنا بھی ناممکن ہو گیا ہے؟ برطانیہ جیسے ملک میں تدفین کی رسومات پر چار پانچ ہزار پونڈ خرچ ہوتے ہیں لہذا اب تدفین کی رسم کے لیے بھی انشورنس متعارف کرایا گیا ہے، صنعتی انقلاب کے نتیجے میں کینسر جیسی کئی موذی اور مہلک بیماریوں کے جدید علاج نے موت کا حصول بھی مشکل بنا دیا، علاج سے مرنے کے لیے لاکھوں روپے کی ضرورت ہے۔ سات ہزار سال کی تاریخ میں سترہ تہذیبوں میں جہاں کبھی خود کشی کی روایت نہیں رہی۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ خود کشی جدید طرز زندگی کے طور پر عام ہو رہی ہے، غربت، معیار زندگی کی آرزو، خوابوں سے بھرپور الف لیلوی پر تعیش زندگی، چکا چوند سے معمور رزق برق خوابناک طرز حیات جو صرف میڈیا پر دکھائی دیتا ہے جدید ایجادات اور ان کی اشتہار بازی سے بے شمار مہلک دماغی، جسمانی اور روحانی امراض مسابقت کی دوڑ میں ناکامی کے باعث پیدا ہو رہے ہیں، ان مہلک امراض کے علاج اتنے مہنگے ہیں کہ زندگی بہ خوشی ہار دینا اور خود کشی کر لینا زیادہ آسان ہو گیا ہے، جو موت قسطوں میں لاکھوں روپے خرچ کر کے ملتی ہو جس کے باعث خاندان، جائیداد، عزتیں اور عورتیں سب بک جاتی ہوں مگر مریض پھر بھی صحت مند نہ ہوتا ہو تو سب کے لیے خود کشی کے راستے کھل جاتے ہیں اسی لیے خود کشی عام ہو رہی ہے خواہ وہ دنیا کے غریب علاقے ہوں یا امیر خطے اس کا سبب شاعر عارف شفیق نے صرف دو مصرعوں میں بتا دیا ہے:

غریب شہر تو فاقے سے مر گیا لیکن امیر شہر نے ہیرے سے خود کشی کر لی

کسی کے پاس کھانے کو روٹی نہیں اور کسی کے پاس کھا کے مرنے کیلئے ہیرا ہے، یہ خدا بے زار معاشروں کا انجام ہے۔

خود کشی صرف غریب آدمی نہیں کر رہا، بڑے بڑے امرا کر رہے ہیں، ان یورپی ممالک میں ہو رہی ہے جہاں آمدنی اور عیاشی سب سے زیادہ ہے، جن کو ہمارے جدیدیت پسند مسلم مفکرین بڑی حسرتوں سے دیکھتے ہیں اور جیسے ہی کسی یورپی ملک سے سفر کر کے آتے ہیں فوراً مدح و ثنا کے لیے سفر تائے لکھتے اور اسلام سے ٹریفک کا نظام ثابت

کرنے لگتے ہیں، مغرب میں محبت، خاندان، رشتوں، روابط، مذہب، اقدار اور اخلاقیات کی موت کے باعث لوگوں کی زندگی بے معنی [meaningless] ہو چکی ہے اس کو معنی دینے کا طریقہ گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ ہے، مگر زندگی پھر بھی بے معنی ہی رہتی ہے نہ خاندان، نہ ماں، نہ بیوی نہ بچے آدمی کس کیلئے جیے کس کیلئے مرے کس کیلئے قربانی دے لہذا بہتر یہ ہے کہ آدمی اپنے ہی لیے مرجائے، ہائیڈرک کے الفاظ میں یہ ”قاتحانہ موت“ آج مغرب کی پسندیدہ تہذیب ہے جسے تیزی سے مقبولیت حاصل ہو رہی ہے، عہد حاضر کا سب سے بڑا فلسفی گلڈیوز [Gills Delluze] اس عہد کے مسائل پر سوچے سوچے پاگل ہو گیا وہ ان مسائل کا کوئی جواب نہ دے سکا تو اس نے ہسپتال کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ اسے صدمہ ہے کہ انسان ابھی تک آزاد نہیں ہو سکا، باپ بیٹی، ماں اور بیٹے کے رشتوں میں مساوات کے فلسفے کے باوجود ابھی تک احترام قائم ہے۔ یہ تعلقات ابھی تک مکمل ناپاک نہیں ہوئے۔ اسے شکایت یہ ہے کہ Incestuous Relations عام کیوں نہیں ہو گئے۔ حالانکہ مغرب میں مساوات کے فلسفے کے باعث حقیقی خونی رشتوں میں جنسی جبر کی شکایات عام ہیں۔ تاریخ انسانی میں کبھی کسی فلسفی نے اس بے بسی کیساتھ اپنی جان کا نذرانہ پیش نہیں کیا۔ جدید مغربی تہذیب اس کی سائنس، ٹیکنالوجی اور اس کے لٹن سے پھوٹنے والے مسائل گلڈیوز کی خودکشی کا سبب ہیں، سوئٹزرلینڈ، ناروے، سویڈن، جرمنی اس وقت عصری تاریخ کے ترقی یافتہ، امیر، سہولتوں سے آراستہ اور جدید فتوحات سے مزین بہت محدود آبادی کے حامل معاشرے ہیں، لیکن سب سے زیادہ خودکشی کی شرح ان خطوں میں ہے تو آخر کیوں؟ مادی ترقی کی معراج پر پہنچنے کے بعد بھی کیا کسی شے کی ضرورت باقی رہ گئی؟ انسان خودکشی کیوں کرتا ہے؟ کیا اسے خودکشی کرنی چاہیے؟ خودکشی کیوں کی جاتی ہے؟ فلاسفہ کے یہاں اس پر دلچسپ بحث ملتی ہے۔ کانٹ کے خیال میں انسانی ذہن بارہ حصوں میں منقسم ہے۔ ہیگل کے خیال میں انکی تعداد ۱۰۵ ہے۔ کانٹ کے خیال میں کوئی عقل مند آدمی خودکشی نہیں کر سکتا۔ ہیگل کے خیال میں خودکشی انسان ہی کرتے ہیں جانور کبھی خودکشی نہیں کرتے۔ کیا عہد حاضر کا انسان جانور سے بھی گھبراہٹ کرے یا خودکشی کوئی قابلِ فخر کام ہے۔ عہد حاضر میں زندگی اتنی اذیتناک کیوں ہو گئی ہے؟

زندگی یقیناً اذیتناک ہے اس لیے کہ عہد حاضر کے انسان کی آرزوئیں اور تمناؤں میں میڈیا اور اشتہارات کی صنعت نے بہت بڑھادی ہیں اس کے نتیجے میں انسان Scarcity کے جدید مادی و روحانی بحران کا شکار ہو گیا ہے جس کا آخری حل خودکشی ہے۔ جزیرۃ العرب کی سخت ترین زندگی میں شب و روز بسر کرنے والے مشرکین نے کبھی خودکشی نہیں کی مگر عہد حاضر کے عیش و عشرت اور سہولتوں میں آنکھ کھولنے والے وحشی اپنی جان پر کیوں کھیل رہے ہیں؟ وہ کیا بنیادی تغیر واقع ہو گیا ہے کہ اونٹ کی جلتی ہوئی پیٹھ پر بیٹھ کر پتے ہوئے صحراؤں میں کوک پیسی اور نیئر اپیک کے دودھ کے بغیر سز کرنے والا فرد کبھی زندگی سے بے زار نہیں ہوتا تھا، عہد حاضر کا عیاش فرد یہ تمام سہولتیں، مراعات، تعیشات، مل جانے کے باوجود مر جانا چاہتا ہے تو کیوں؟ اگر عہد جدید کے مسلم مفکرین ان باریکیوں، نزاکتوں اور نکوتوں

سے واقف نہیں تو وہ خطبہ جمعہ سننا ترک کر دیں اور اپنے لیے ہیگل کے جدلیاتی افکار پر مبنی دجل سے نیا خطبہ جمعہ تیار کریں۔ [خود کشی کی تفصیلات کے لیے انٹرنیٹ پر بے شمار معلومات میسر ہیں۔]

حسین نصر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر تہذیب کو سائنسی ترقی اس قوم کے دور زوال میں ملی لیکن اس تاریخی تجزیے کو تسلیم کرنے کے بعد وہ مسلمانوں کی سائنسی ترقی کے دور عروج کو ہی اصلاً دور عروج سمجھتے ہیں، اسے زوال کی علامت کے طور پر قبول نہیں کرتے اور اس امر پر تعجب کرتے ہیں کہ اس عروج پر زوال کیوں آ گیا؟ اور اس زوال سے عروج کے خراب راستہ کیسے نکالا جائے؟ یعنی دنیا کی تاریخ میں تمام تہذیبوں اور اقوام میں مسلمان وہ واحد تہذیب، قوم یا امت ہے جس کو سائنسی ترقی دور زوال میں نہیں مسلمانوں کے دور عروج میں ملی۔ ایک جانب وہ عہد عباسی کو عہد ملوکیت بھی قرار دیتے ہیں، ملوکیت کو تمام گناہوں کی جڑ کہتے ہیں اور اس ملوکیت سے نکلنے والی سائنس کو عظیم اسلامی سرمایہ تسلیم کرتے ہیں اور اس سرمایے کے دوام کے لیے کوشاں رہنے کو مقصود قرآن اور مطلوب رسالت محمدی ﷺ قرار دیتے ہیں، ملوکیت کو تمام گناہوں کی جڑ قرار دینا تاریخی طور پر خالص سیاسی مادی اور دور جدید میں خالص مغربی نقطہ نظر سے ہم آہنگ فکر ہے جو جمہوریت اور جدید مغربی تصور تاریخ سے برآمد ہوا ہے جس کی عمر تین سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ کو ملوکیت کی تاریخ سمجھنا رد عمل کی نفسیات سے برآمد ہونے والا نتیجہ ہے جو جمہوریت کے کفر سے خاص تعلق رکھتا ہے اور حاکمیت جمہور کے ذریعے حاکمیت اللہ کے تصور کو جڑ بنیاد سے ختم کر دیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ نقطہ نظر اپنی تاریخ کا انکار ہے جو ملت اپنی تاریخ رد کر دے وہ صحرا میں تنہا کھڑی ہوگی اور سراب کی تلاش میں رہے گی۔ حسین نصر کے ان تضادات کی تشریح و توجیہ کے لیے ہمیں کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں، حسین نصر اور مکتبہ روایت سے وابستہ مفکرین اسلامی سائنس کی نہایت عالمانہ اور پر جوش وکالت کے باوجود یہ نہیں بتا سکے کہ مسلمان کا دور عروج تو عہد رسالت مآب ﷺ اور عہد خلافت راشدہ ہے اور بلاشبہ خیر القرون ہے لیکن اس عظیم عہد اور اس کے بعد خلافت راشدہ کے زیریں ادوار میں سائنس کی ترقی کے لیے کیا لائحہ عمل مرتب کیا گیا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ خیر القرون سائنس کی عظیم ترقی سے کیوں خالی رہا؟ کیا علوم عقلیہ اور روحانیت اور شعور ایمانی کے مقابلے میں علوم عقلیہ کی ذرہ برابر بھی وقعت نہیں تھی۔ کبار صحابہ کرام میں کتنے سائنس داں تھے، سائنس کے بغیر ہی مسلمانوں نے تین براعظموں کو کیسے فتح کیا؟ امت مسلمہ کا اصل کردار وہ ہے جب وہ مادی طور پر نہایت ہلکی اور اخلاقی و روحانی طور سے سب پر فضیلت کی حامل تھی یا وہ دور جب اسے دنیا میں مادی طور پر برتری حاصل ہوگئی تھی اگر مادی دور بہتر تھا تو اسی دور میں تاتاریوں جیسی کم زور قوم نے انہیں کیسے شکست دے دی؟ اور انڈس عظیم سائنسی ایجادات کے باوجود اپنا تحفظ کیوں نہ کر سکا کہ وہاں کوئی مسلمان باقی نہ بچا؟

یہ سوال اہم ہے کہ ہمسایہ اقوام کی مادی ترقی تہذیب سائنس فن تعمیرات سے ام القریٰ کے مسلمان کیوں مرعوب و متاثر نہ ہوئے؟ اور مدینہ النبی میں ان فنون اور علوم عقلیہ کی درآمد میں کیا امر مانع رہا؟ اس سوال پر بھی غور کی

ضرورت ہے کہ مسلمان ہمسایہ اقوام کے علوم عقلیہ اور محیر العقول فلسفہ و سائنس سے اگر مرعوب ہو جائے تو کیا وہ روم و ایران کو فتح کر سکتے تھے؟ رومی اپنی تمام تر طاقت کے باوجود ایران کو فتح نہ کر سکے لیکن مسلمانوں نے نہ صرف سرزمین ایران کو فتح کر لیا بلکہ اس خطے کے لوگوں کے قلب بھی تسخیر کر لیے اور عظیم الشان رومی سلطنت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ مسلمانوں کے پاس روم و ایران کی سائنس، ٹیکنالوجی کے مقابلے میں صرف ایمان کی قوت تھی ان قوتوں کا خاتمہ کرنے والے ان ختم ہونے والی سلطنتوں کی مانند، علم عقلیہ کے مقابلے میں کس حیثیت اور کس مقام کے حامل تھے اس کے لیے تمام مروجہ تاریخوں کا مطالعہ کر لیا جائے۔

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا [الفرقان: ۳۰]۔ ”اے میرے رب میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانہ تضحیک بنا لیا تھا۔“ یہ آیت صرف عہد رسالت کے کفار مشرکین کے لیے نہیں ہے اس عہد کے جدیدیت پسند مسلمانوں کے لیے بھی ہے جنہوں نے اس قرآن کی تضحیک کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ قرآن کے معنی Hermenenties سے متعین ہوں گے، کبھی کہتے ہیں کہ کلام عرب سے اخذ ہوں گے، کبھی کہتے ہیں کہ اسکے جو معنی عہد رسالت میں تھے اب وہ نہیں ہیں، ان میں جو بہت زیادہ جری ہیں انکو شکوہ ہے کہ اس قرآن کو لے کر ہم کیا کریں اس میں نہ سائنس ہے، نہ سوشل سائنس، نہ منطق اس کی آیات سے نہ ہم ایٹم بم بنا سکتے ہیں، نہ ہوائی جہاز، یہ قرآن عہد حاضر میں کسی کام کا نہیں ہے۔ نعوذ باللہ، دوسری جانب معذرت خواہ سادہ لوح اور جاہل مفکرین اسی قرآن سے تمام مغربی، مادی، عقلی اور سائنسی علوم کو ثابت کر رہے ہیں۔ مگر اس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ عجیب بات ہے کہ قرآن تمہارے پاس تھا اور قرآن میں مستور و مخفی تمام علوم کافروں کو مل گئے جن میں سے کسی ایک سائنس داں نے کبھی بھول کر قرآن نہیں پڑھا اور نہ قرآن کے ذریعے کوئی سائنسی فارمولہ دریافت کیا۔

دکھی انسانیت کے نام

آج بیمار انسانیت عطائی معالجین کے ہاتھوں اپنا مرض بڑھا کر سسک سسک کر دم لے رہی ہے میرے بھائیو! صحیح علاج کیلئے دوا کے ساتھ ساتھ تدبیر اور غذا کی موافقت بھی لازمی ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ خونی جیش ہوں، تنگے کباب روٹ وغیرہ بھی کھائے جائیں اور پھر شفا کی امید بھی رکھی جائے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ گوشت خوری بھی کی جائے اور تیزابیت بھی نہ ہو دودھ اور چاول کھائے جائیں اور زلہ زکام کو فائدہ ہو جائے، جگر کی تحریک میں سبھی کا کھانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

میرے بھائیو! حکمت، ہنرمندی کا کھیل نہیں یہ طویل ترین ریاضت، تجربہ اور محنت کے ساتھ ساتھ قلب و نظر کی پاکیزگی اور توجہ الی اللہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، ہفتہ لہائی چالیس سالہ تجربہ کے دوران کم از کم ایک لاکھ لگی وغیرہ لگی مریضوں کا علاج کر چکا ہوں، طبیعہ کے کالج کا سابقہ لیکچرار ہوں۔ دو ایوارڈ اور ایک گولڈ میڈل حاصل کر چکا ہوں۔ خدا نخواستہ آپ کبھی بھی مرض میں مبتلا ہیں تو ایک مرتبہ مجھے علاج کا موقع دیں انشاء اللہ شفا کا ملہ و جاہلہ ہوگی۔ بذریعہ ڈاک بھی دوا مل سکتی ہے۔

ایام ملاقات: بروز جمعہ اور ہفتہ : حکیم حاجی عبدالکریم بھٹی لاہور ملتان روڈ، حبیب آباد (واں راہ دارام) ضلع قصور